مذہبی اور غیر مذہبی علوم کے اِصلاح طلب پہلو

مِنہاجُ القرآن پبلیکیشنز

365-ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 042-111-140-140

یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 042-7237695

www.Minhaj.org - sales@Minhaj.org

www.MinhajBooks.com

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَـوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ

مُـحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش

www.MinhajBooks.com

حکومتِ پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔ا) ۴-۱-۴ / ۸۰ پی آئی وی، مؤرّخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء؛ حکومتِ بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷-۴-۲۰ جنرل وایم۴ / ۷۰-۹-۳-۷، مؤرّخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء؛ حکومتِ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی چٹھی نمبر ۱۱۴۴۱-۶۷ این۔ا / اے ڈی (لائبریری)، مؤرّخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء؛ اور حکومتِ آزاد ریاست جموں و کشمیر کی چٹھی نمبر س ت / اِنتظامیہ ۶۳-۱۶۰۸ / ۹۲، مؤرّخہ ۲ جون ۱۹۹۲ء کے تحت ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کی تصنیف کردہ کتب تمام سکولز اور کالجز کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

جملہ حقوق بحقِ تحریکِ منہاجُ القرآن محفوظ ہیں

نام کتاب	:	مذہبی اور غیر مذہبی علوم کے اِصلاح طلب پہلو
تصنیف	:	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
پروف ریڈنگ	:	محمد فاروق رانا
زیرِ اہتمام	:	فریدِ ملّت رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ Research.com.pk
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور
اِشاعتِ اَوّل	:	جنوری 1987ء (2,000)
اِشاعتِ دوُم	:	مئی 1987ء (5,000)
اِشاعتِ سوُم	:	اکتوبر 1994ء (2,000)
اِشاعتِ چہارُم	:	ستمبر 2007ء
تعداد	:	1,100
قیمت	:	-/20 روپے

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور ریکارڈڈ خطبات و لیکچرز سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے **تحریکِ منہاجُ القرآن** کے لیے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلی کیشنز)

sales@minhaj.org

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش www.MinhajBooks.com

فہرس

صفحہ	عنوانات
۷	❁ پیش لفظ
۱۰	مذہبی اور غیر مذہبی علوم میں اِمتیاز
۱۱	مذہبی علوم اور اُن کے اِصلاح طلب پہلو
۱۱	۱۔ علمِ تفسیر
۱۱	۲۔ علمِ حدیث
۱۲	۳۔ علمِ فقہ
۱۲	۴۔ علمِ کلام
۱۲	۵۔ تصوف
۱۲	۶۔ تاریخ
۱۷	اِصلاح کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی؟
۱۸	مذہبی علوم اور اُن کے موضوعات
۱۸	۱۔ علمِ فلسفہ (Philosophy)
۱۸	۲۔ علمِ اَخلاقیات (Ethics)

www.MinhajBooks.com

عنوانات	صفحہ
۳۔علمِ عمرانیات (Sociology)	۱۸
۴۔علمِ معاشیات (Economics)	۱۸
۵۔علمِ سیاسیات (Political Science)	۱۸
فطری علوم اور اُن کی ضروریات	۱۹
علمِ طبیعات کے مقولات	۲۰
اِنسانی علوم کے اِصلاح طلب پہلو	۲۱
علوم کی اِصلاح کا رُخ	۲۳

www.MinhajBooks.com

پیش لفظ

دورِ زوال سے قبل اِسلام کی تاریخ میں ایک ہی نظامِ تعلیم رائج تھا جس میں مذہبی اور غیر مذہبی دونوں علوم پڑھائے جاتے تھے۔ دینی مدارس میں غیر مذہبی علوم بھی درسِ نظامی کا حصہ تھے۔ مذہبی علوم میں تفسیر و اُصولِ تفسیر، حدیث، فقہ، اُصولِ حدیث، اُصولِ فقہ، علم الکلام و علومِ معانی شامل تھے اور غیر مذہبی علوم میں طب، ہندسہ، ریاضی، جیومیٹری، جغرافیہ، ہیئت، منطق اور فلکیات شامل تھے۔ موازنہ کیا جائے تو یہ دونوں الگ الگ میادینِ علم تھے لیکن ایک ساتھ چلتے تھے اور یہ سارا دینی نصاب کہلاتا تھا کیوں کہ اس دور میں علماء کے ذہن میں مذہبی و غیر مذہبی علوم کا جداگانہ تصور کوئی نہ تھا۔ مگر شومئی قسمت کہ بعد میں سائنس اور انگریزی تعلیم کو مذہبی تعلیم سے علیحدہ تصور کیا جانے لگا اور انہیں حاصل کرنے والے کو کافر کہا جانے لگا اور یہ تصور کیا جانے لگا کہ شاید ان علوم کو حاصل کرنے والے کا مذہبی علوم اور دین کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں۔

یہ اَمر واقع ہے کہ دورِ اُولیٰ میں فارابی، ابن سینا جیسے لوگ پیدا ہوئے جو بہ یک وقت بہت بڑے محقق اور سائنس دان ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم عالمِ دین بھی تھے۔ عالمِ دین ہوتے ہوئے بھی اُن کی سائنس کے علوم میں اتنی زیادہ دست رَس تھی کہ آج کی سائنس بھی اُن سے مستفیض ہو رہی ہے۔ اُس دور کے علما کے لیے ضروری تھا کہ سائنس کو ساتھ لے کر چلیں۔ اگر وہ مکمل سائنس نہ پڑھتے تو مکمل عالمِ دین نہ بنتے بلکہ ان سائنسی علوم کے بغیر کوئی عالمِ دین ہی نہیں کہلاتا تھا۔ آج سے اڑھائی تین سو سال قبل جب جدید علوم (modern sciences) یعنی فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی وغیرہ کا وجود نہ تھا تو ان کی جگہ فلسفہ، منطق، طب، فلکیات وغیرہ داخلِ نصاب تھے۔ بعد میں مضامین وُسعت پذیر ہونے کی وجہ سے طبیعات، کیمیا، حیاتیات وغیرہ کے ناموں سے موسوم ہوگئے مگر جدید

سائنس اور ٹیکنالوجی میں ڈھلتے ہی یہ علوم دینی و مذہبی ذہن کے لیے اَجنبی بن گئے اور دائرۂ دین سے خارج متصوّر ہونے لگے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج کے بدلے دور کے تقاضوں کے تحت صرف قرآن حکیم کا دیا ہوا تعلیمی و تربیتی منہاج ہی ہمیں زوال کی اتھاہ گہرائیوں سے اُٹھا کر اس منصبِ جلیلہ پر فائز کر سکتا ہے کہ ہم ایک طرف اپنے ملی وقومی وجود کو حیاتِ تازہ عطا کریں تو دوسری طرف اَغیار کے تعلیمی و تربیتی فکر کے سرابی محلات کو مسمار کر دیں۔

زیرِ نظر کتابچہ میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مد ظلہ العالی نے مذہبی اور غیر مذہبی علوم کے وہ اِصلاح طلب پہلو بیان کیے ہیں جو ان علوم کے مابین کھینچی گئی حدِ فاصل کو ختم کر کے انہیں پھر سے یک جا کر سکتے ہیں اور جن کی باہمی درس و تدریس سے اُمتِ مسلمہ اپنا کھویا ہوا وقار بحال کر سکتی ہے۔

محمد فاروق رانا

ڈپٹی ڈائریکٹر ریسرچ

فرید ملّت رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ

۶ ستمبر، ۲۰۰۷

www.MinhajBooks.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَربابِ علم و دانش نے علم کی تعریف یوں کی ہے:

العلم إدراک الشیء بحقیقته.

’’علم کسی چیز کو اس کی حقیقت کے اعتبار سے جان لینے کا نام ہے۔‘‘

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ علم کا اطلاق ایسے قضیے پر ہوتا ہے جو محکوم اور محکوم بہ پر مشتمل ہو، جس کے متوازی خارج میں ویسی ہی حقیقت موجود ہو جیسی قضیے میں بیان ہوئی ہے۔ اب ہر قضیہ علم نہیں ہوسکتا۔ جس قضیے پر علم کا اطلاق ہوتا ہے وہ ایسا قضیہ ہے جو کلی ہو، وجوبی ہو اور وجودِ خارجی کے حوالے سے صحت کا مصداق ہو۔ مثلاً تمام اِنسان فانی ہیں، یہ قضیہ علم ہے مگر انسان حیوان ناطق ہے، یہ قضیہ علم نہیں کیوں کہ یہ قضیہ، قضیۂ تحلیلہ ہے۔ یعنی پہلے سے معلوم بات کی تحلیل اور تجزیہ کرکے اسے دوبارہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس قضیے میں محکوم بہ کو محکوم کے تجزیے سے فراہم کیا جاتا ہے جس کے متوازی خارج میں اس کے مصداق کا وجود ضروری نہیں ہے۔ چوں کہ حیوانِ ناطق ہی کو انسان کہتے ہیں اس لیے انسان کا تجزیہ کرکے اسے حیوانِ ناطق کہنا علم نہیں ہے۔ جیسے یہ کہنا کہ تمام اَجسام متحیز ہیں یعنی تمام اجسام میں موٹائی، لمبائی اور چوڑائی ہوتی ہے۔ اسی موٹائی، چوڑائی اور لمبائی یعنی تحیز ہی کو جسم کہتے ہیں۔ چنانچہ اَجسام کو متحیز کہہ دینا قضیۂ تحلیلہ ہوا، یہ قضیہ علمیہ نہیں کہلائے گا۔ جب کہ ممکن ہے کہ علم ایک طرف ناظر اور دوسری طرف منظور ہو۔ ناظر میں علم کی استعداد ہو اور منظور ایسا ہو جو ناظر کی استعدادِ علم سے جانا جا سکتا ہو۔ ان چاروں شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہ ہو تو علم ناممکن ہوگا۔ جیسے ذاتِ باری تعالیٰ کا علم اس لیے ناممکن ہے کہ ہماری کوئی استعداد اس کے ادراک کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ جس دور

میں یہ موقف پیشِ نظر رہا ہے کہ صرف عقل ذریعہ علمِ حقیقت ہے، قضیۂ تحلیلیہ کو علم سمجھا جاتا رہا ہے، حالاں کہ وہ علم نہیں تھا۔ لہٰذا تمام ورائے محسوسات حقائق کا علم ممکن نہیں۔ ان پر ایمان لایا جا سکتا ہے، مزید یہ کہ ان کے ہونے کا یقین ہوسکتا ہے مگر علم نہیں ہوسکتا۔ جیسے:

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ.(۱)

’’جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔‘‘

اور

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ٥(۲)

’’اور وہ آخرت پر بھی (کامل) یقین رکھتے ہیں٥‘‘

اِسی طرح ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصل دونوں میں بیان ہونے والے حقائق علم کے مصداق نہیں۔ اس لیے انہیں ایمان باللہ اور ایمان بالغیب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک اور بات بھی ذہن نشین رہے کہ مذکورہ بالا چاروں شرائطِ علم کو سمجھنے سے تین مختلف چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ حقیقت جسے جانا جا رہا ہے، جسے ہم نے منظور کا نام دیا ہے اور جو معلوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرا وہ قضیہ جو اس منظور کے علم پر مشتمل ہے اور تیسری وہ استعداد جو ادراک کا ذریعہ ہے۔ گویا حقیقت، علم اور ذریعۂ علم تینوں چیزیں مختلف ہیں۔ ان میں کوئی التباس نہیں ہونا چاہیے۔ اس امتیاز کے پیشِ نظر غور کریں تو تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف، تاریخِ اسلام، فلسفہ، معاشیات، سیاسیات، طبیعات اور حیاتیات وغیرہ پر علم کا اطلاق ہوگا جب کہ ان کے ذرائع اور موضوعات الگ الگ ہوں گے۔

مذہبی اور غیر مذہبی علوم میں اِمتیاز

غیر مذہبی علوم کے عنوان سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے کہ ان سے مراد

(۱) البقرہ، ۲: ۳

(۲) البقرہ، ۲: ۴

خلافِ دین علوم ہیں بلکہ وہ علوم جن کی ترتیب وتدوین کا محرک مذہب ہو مذہبی علوم کہلاتے ہیں جب کہ غیر مذہبی علوم دو اقسام پر مشتمل ہیں: انسانی علوم (human sciences) اور فطری علوم (natural sciences)۔ ان میں وہ تمام علوم وفنون شامل ہیں جن کی تدوین کا محرک مذہب نہیں۔ ان علوم کو غیر مذہبی (secular) قرار دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ تعلیماتِ اسلام کے منافی ہیں۔ بعض ذہنوں میں مغالطہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ سیکولر (secular) کا معنی صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا۔ عام طور پر secular کا معنی انکارِ مذہب تصور کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ secular کا معنی یہ ہے کہ مذہب کو نجی، ذاتی اور شخصی مسئلہ تصور کیا جائے اور اس کا کوئی تعلق سیاسی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی سے تسلیم نہ کیا جائے۔ گویا دنیا اور مذہب کے درمیان اس تقسیم کو سیکولر اِزم (secularism) کا نام دیا جاتا ہے۔

مذہبی علوم اور اُن کے اِصلاح طلب پہلو

ا۔ علمِ تفسیر

یہ اِس سلسلے کا پہلا علم ہے۔ اس کا موضوع قرآن حکیم ہے جو یقیناً تفسیر سے متمیز ہے۔ کیوں کہ قرآن وہ حقیقت ہے جس کے علم کا نام تفسیر ہے، یعنی قرآن نص ہے اور تفسیر اس کی تعبیر، جس کا مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کیا ہے؟

۲۔ علمِ حدیث

اِس کا موضوع سنتِ رسول اکرم ﷺ ہے۔ جس کا مسئلہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا قول وعمل کیا تھا؟

۳۔ علمِ فقہ

اِس کا موضوع انسانی زندگی سے متعلق اوامر ونواہی ہیں۔ جس کا مسئلہ یہ ہے کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے؟ کتبِ حدیث اور بالخصوص کتبِ سنن کے اُسلوبِ تبویب کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر علمِ حدیث کی تدوین کا اصل محرک بھی فقہ ہی تھا۔ گویا انسانی زندگی کو منظّم کرنے والا ضابطہ اور اس کی اصل سنتِ رسول ﷺ سے دریافت کرنے کے لیے اَحادیثِ رسول ﷺ کو جمع اور مرتب کیا گیا۔

۴۔ علمِ کلام

اس کا موضوع عقائد ہیں۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ عقائد کی عقلی اساس کیا ہے؟ اس کا وظیفہ (function) عقائدِ صحیحہ کی تائید اور عقائدِ باطلہ کی تردید میں اِستدلال فراہم کرنا ہے۔

۵۔ تصوف

اِس کا موضوع طریقت ہے۔ جس کا مسئلہ یہ ہے کہ اَحکامِ فقہ کی بجا آوری میں اخلاص کیسے پیدا ہوگا؟

٦۔ تاریخ

تاریخِ اسلام کا موضوع دو اَدوار کے بیان پر مشتمل ہے: دورِ رسالت اور دورِ مابعد رسالت۔ بحیثیت علم کے تاریخ کا مسئلہ اُمت کے عروج و زوال کے اَسباب کی جستجو ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اِنسانی اِستعداد کے یہ زائیدہ مذہبی علوم زندگی میں نتائج پیدا کرنے میں مؤثر نہیں رہے۔ حتیٰ کہ اِسلام کے عقیدہ وعمل کا کوئی اثر ہماری حیاتِ اجتماعی پر باقی نہیں رہا۔ عقائد اَوہام میں اور عبادات رسوم وظواہر میں بدل کر رہ گئی ہیں۔ ان کا علاقہ عملی زندگی سے یکسر منقطع ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی مذہبی اور غیر مذہبی

(religious and secular) کے دو شعبوں میں تقسیم ہوگئی ہے اور اس کی ثنویت و غیریت کو کسی سطح پر ختم نہیں کیا جا سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب کے سب علوم اس سوال کا جواب ہیں کہ یہ کیا ہے؟

علم کا ایک تقاضا ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ اِس تقاضے کے غالب آنے کی وجہ سے علم بالوحی اِنسانی اِستعداد کے زائیدہ علم کے نمونے پر ڈھل گیا اور علم کا ایک ویسا ہی شدید مطالبہ ہم آہنگی کے تقاضے کے تحت نظر انداز کر دیا گیا جو یہ تھا کہ مماثل فضائل کے درمیان امتیازات کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس تقاضے کے نظر انداز ہو جانے سے علم بالوحی کے اِس مسئلے کی نوعیت سے صرفِ نظر ہو گیا کہ زندگی پسندیدہ نمونے پر ڈھلے کیسے؟ اس سوال سے صورتِ حال کا اثر یہ ہوا کہ:

۱۔ علمِ تفسیر

علمِ تفسیر اِس جستجو سے دست بردار ہو گیا کہ قرآن حکیم جس نمونے پر انسانی زندگی کو ڈھالنا چاہتا ہے، وہ کیسے ڈھلے گی؟ یعنی قرآن حکیم جس طرح کا انسان چاہتا ہے، وہ کس طرح میسر آئے گا؟

۲۔ علمِ حدیث

علم حدیث اِنسانی استعداد کے زائیدہ علم کے نمونے پر ڈھل گیا تو یہ جستجو پیش نظر نہ رہ سکی کہ جن عملی نتائج تک علم بالوحی پہنچانا چاہتا ہے، اس تک پہنچنے میں حدیث سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔ اسے سنتِ رسول ﷺ کی حدود سے آج پھر کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے؟

۳۔ علمِ فقہ

علم فقہ کے انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے نمونے پر ڈھل جانے سے قرآنی اَحکام کے بارے میں اس مقصد سے صرفِ نظر ہو گیا کہ اَوامر و نواہی کے مطابق اور جائز و

ناجائز کے امتیاز پر زندگی عملاً کیسے استوار ہوگی؟ اگر تفسیر، حدیث اور فقہ کے مروّجہ علوم کے دائرہ کار پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت اَظہر من الشّمس ہو جاتی ہے کہ یہ تمام مذہبی علوم صرف حلال وحرام، جائز و ناجائز، مستحب و مکروہ اور پسندیدہ و ناپسندیدہ یعنی انسانی اعمال کے لیے صحت اور عدم صحت کی حدود کے بیان تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ انسانی احوال کو بدلنے کی تدبیر ان کے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن اس وقت تک عالمِ اسلام کو یہ مسئلہ درپیش ہے کہ فرد اور معاشرہ دونوں ان امور کو جان لینے کے باوجود تمرد اور اِنحراف کے راستے پر گامزن ہیں۔

مسلمانوں کو اِجتماعی زندگی اِنتشار، اِضمحلال اور اِنحطاط کا شکار ہے، جس سے نکلنے کی آرزو کے باوجود وہ اس سے نکل نہیں پاتے اور اصلاح کی تمام فکری اور عملی کوششیں بے نتیجہ ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ متداول علوم غلط اور صحیح کی نشان دہی اور امتیاز کر دینے کے باوجود اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ صحیح راستے پر کس طرح گامزن ہوا جائے؟ مطلوبہ نمونہ کمال کے مطابق زندگی کس طرح بسر ہو؟ اور اَحوالِ زندگی کا جو معاملہ بگڑ چکا ہے، اسے پھر سے کس طرح سنوارا جائے؟ گویا اسلام جس تباہی سے بچانا چاہتا ہے، ملتِ اسلامیہ اس تباہی و ہلاکت سے کیسے بچے؟ محض مقصد اور نصب العین کا بیان کر دینا ہی کافی نہیں، جب تک اس مقصد کے حاصل کرنے کی تدبیر اور حتمی طریقِ کار بیان نہ کیا جائے، کسی علم کی تاثیر وافادیت مسلّم نہیں ہو سکتی۔

۴۔ علم الکلام

اِس علم کا وظیفہ زیادہ سے زیادہ ان شکوک کو باطل کرنا ہے جو عقائدِ صحیحہ کی نسبت ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یقینِ کامل اور رسوخ فی الایمان علمِ کلام کے حوالے سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ یقین ہمیشہ نتائج کی تجربی توثیق اور شہادت سے میسر آتا ہے جب کہ ایمان بالغیب کی حیثیت ایمانِ وہبی کی ہے، جس کی بنیاد صاحبِ نبوت ﷺ کا بیان ہے۔ اس کی وضاحت اس میں ہے کہ غایتِ تخلیق، غایتِ بعثت اور غایتِ نزولِ قرآن ایک ہی ہے۔ عملی نتائج ان کائناتی قوانین سے متعین ہوتے ہیں جو نظامِ تکوین میں

متعین کر دیے گئے ہیں اور ایمان بالغیب وہ ایمان ہے جو عملی جد و جہد سے پہلے درکار ہے۔ اس کے بغیر مقصد کے لیے جان کی بازی نہیں لگائی جا سکتی۔

۵۔ علمِ تصوف

اِس علم کا موضوع عملی زندگی میں اخلاص اور للّٰہیت پیدا کرنا ہے۔ جس کا مسئلہ یہ ہے کہ اتباعِ شریعت میں حسنِ نیت اور خلوص کیسے پیدا ہوگا؟ مگر جب سے تصوف عمل کی بجائے ماورائی حقیقت کا علم بنا ہے، اس کے نتائج عملی زندگی پر مرتب ہونا بند ہوگئے ہیں۔ اب علمِ تصوف کی تاثیر اور نتیجہ خیزی اُسی وقت برآمد ہو سکتی ہے جب انسانی زندگی پہلے شریعت کے سانچے میں ڈھل جائے۔ اس کے بعد اس میں تشرع اور ریاکاری کے خاتمہ کے لیے تصوف اپنا انقلاب انگیز کردار ادا کر سکتا ہے۔

۶۔ علمِ تاریخ

تاریخِ اِسلام بھی عروج و زوال کی توجیہ کا علم بن کر رہ گئی ہے جس میں جبر کا شائبہ غالب ہے۔ اس کی جستجو عروج و زوال کو بطور واقعہ موضوع بنا کر ہو سکتی ہے لیکن اس توجیہ میں مسلط ہو جانے والے زوال کے رُخ کو عروج کی سمت پھیرنا داخل نہیں ہے، جب کہ اِس وقت عالمِ اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ زوال کو عروج میں کیسے بدلا جائے؟ یہ مسئلہ اُس وقت حل ہوگا جب تاریخ کو تجدیدِ ملل اور تخلیقِ اُمم کا عمل قرار دیا جائے جو قرآن حکیم کا نقطہ نظر ہے۔ جیسا کہ سورہ ہود کے آخر میں مذکور ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ.(۱)

”اور ہم رسولوں کی خبروں میں سے سب حالات آپ کو سنا رہے ہیں جس سے ہم آپ کے قلبِ (اَطہر) کو تقویت دیتے ہیں۔“

(۱) ھود، ۱۱: ۱۲۰

اللہ تعالیٰ حضور نبی اکرم ﷺ پر اَنبیاے سابقین کے واقعات اس لیے بیان کرتا ہے کہ ان سے آپ ﷺ کے قلبِ اَطہر کو تسکین اور تقویت ملے۔ مگر انبیاے سابقین کے قصوں سے دل کو تقویت اور تسکین اُسی وقت میسر آ سکتی ہے جب ہر قصے سے یہ نتیجہ برآمد ہو کہ غلبہ اَصحابِ حق ہی کو حاصل ہوتا رہا ہے اور یہ نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے جب اَصحابِ حق کا غلبہ اور اَصحابِ باطل کی شکست کسی ایسے قانون سے متعین ہو جو ناقابلِ تغیر اور ناقابلِ شکست ہو اور اس کی خلاف ورزی ممکن نہ ہو۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ○(۱)

”اور اِسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے جرائم شعار لوگوں میں سے (ان کے) دشمن بنائے تھے (جو ان کے پیغمبرانہ مشن کی مخالفت کرتے اور اس طرح حق اور باطل قوتوں کے درمیان تضاد پیدا ہوتا جس سے انقلاب کے لیے سازگار فضا تیار ہو جاتی تھی) اور آپ کا رب ہدایت کرنے اور مدد فرمانے کے لیے کافی ہے○“

پیغمبرانہ دعوت کے راستے میں کی جانے والی مزاحمت سے دعوت کے خاطرخواہ نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس کا اعلان قرآن حکیم یوں کرتا ہے:

لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ.(۲)

”یقیناً میں اور میرے رسول ضرور غالب ہو کر رہیں گے۔“

لہٰذا تاریخ کی اِصلاح یوں ہوگی کہ زوال کا رخ عروج کی طرف پھیرنے کے لیے قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کی جائے جو مذکورہ بالا قانون کے حوالے کے بغیر میسر

(۱) الفرقان، ۲۵: ۳۱

(۲) المجادلہ، ۵۸: ۲۱

نہیں آ سکتی۔ چنانچہ مذہبی علوم کی جونشو ونمااب تک ہو چکی ہے، اس کی صحیح سمت مقرر کرنے کے لیے علم بِالوحی سے رہنمائی طلب کی جائے تا کہ زوال و اِنحطاط میں مبتلا ملت کے غلبہ وعروج کی طرف بڑھنے کے لیے مذہبی علوم کا جائزہ لے کر ان کی نشو ونما کی تکمیل کا رُخ متعین کیا جاسکے۔ کیوں کہ علم بِالوحی دَرحقیقت عمل کا علم ہے۔ گویا یہ نصب العین اور اس کے حاصل کرنے کے نتیجہ خیز طریقہ کار کا علم ہے۔ جب اس طریقہ کار سے نتائج پیدا ہو جائیں جو اِنسانی اِستعداد کے زائدہ علوم کے موضوعات ہیں، تو ان کی توجیہ کی ضرورت پیش آئے گی۔ اگر مطلوبہ نتائج پیدا ہی نہیں ہوئے تو ان کی توجیہ عملاً کیسے اثر پیدا کر سکتی ہے؟ توجیہ کے ڈھب پر مرتب ہونے والے تمام علوم موجودہ اَقدارِحیات کی حفاظت تو کر سکتے ہیں مگر مٹی ہوئی اَقدار کو زندہ نہیں کر سکتے۔

اِصلاح کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی؟

یہ اَمر ملحوظ رہے کہ ہمارے تمام متداولہ مذہبی علوم اُسی دور میں مرتب و مدون ہوئے تھے جب اِسلام کا سیاسی غلبہ بحال تھا۔ شریعت، طریقت اور مسالک اپنے میدانوں میں مؤثر طور پر فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ چناں چہ اُس وقت مسلمانوں کی حیاتِ اِجتماعی میں موجودہ اَقدار (existing values) کو محفوظ کیا جا رہا تھا۔ لیکن جب سے ہمارے ہاتھوں سے سیاسی غلبہ چھن گیا، ان علوم کے پیچھے قوتِ نافذہ باقی نہ رہی، غلبۂ اِستعمار اور طویل دورِ غلامی نے ہماری اَقدارِ حیات کو مٹا کر ختم کر دیا بلکہ ان کی جگہ منفی اور غیر اِسلامی اَقدار نے لے لی۔ چناں چہ اب سیاسی اور معاشی سطح پر اس صورتِ حال یعنی status quo کو بحال رکھتے ہوئے محض توجیہی علوم کی مدد سے ختم شدہ اَقدار کو زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ علوم تو موجودہ اَقدار کو محفوظ کرنے کے لیے معرضِ وجود میں آئے تھے، ان سے آج حیاتِ ملی کو اَز سرِ نو زندگی نہیں بخشی جاسکتی۔ آج ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ مذہبی علوم کے ذریعے معیاری دین اور معمول بہٖ دین میں اِمتیاز پیدا کیا جائے اور پھر اس اِمتیاز کی روشنی میں اُن کی تکمیل کا رُخ دوبارہ متعین کیا جائے۔

مذہبی علوم اور اُن کے موضوعات

۱۔ علمِ فلسفہ (Philosophy)

اس سلسلے کا پہلا علم فلسفہ ہے۔ جس کا موضوع من حیث الکل کائنات کی ماہیتِ اَصلی ہے۔ اِس کا مسئلہ یہ رہا ہے کہ حقیقت من حیث الکل کیا ہے؟ اِس میں اِنسان کا مقام ومنصب کیا ہے؟ اور اس مقام ومنصب کے لحاظ سے اِنسان کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟

۲۔ علمِ اَخلاقیات (Ethics)

دوسرا علم اَخلاقیات ہے۔ اِس کا موضوع معیارِ اَخلاق ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ فضائلِ اَخلاق کیا ہیں؟ اُن کا معیار کیا ہے؟ اور ان کی مابعد الطبیعی اساس کیا ہے؟

۳۔ علمِ عمرانیات (Sociology)

تیسرا علم عمرانیات کا ہے۔ اس کا موضوع معاشرہ ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ معاشرہ کیسے وجود میں آتا ہے؟ کیسے ترقی کرتا ہے؟ اور کیسے زوال پذیر ہوتا ہے؟

۴۔ علمِ معاشیات (Economics)

چوتھا علم معاشیات کا ہے۔ اِس کا موضوع تخلیقِ دولت کا نظام ہے۔ جس کا مسئلہ یہ ہے کہ دولت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ اس کی تقسیم کیسے ہوتی ہے؟ اور یہ کس طرح صرف ہوتی ہے؟ یعنی دولت کی پیدائش (production)، تقسیم (distribution) اور صرف (consumption) اس کے مسائل ہیں۔

۵۔ علمِ سیاسیات (Political Science)

پانچواں علم سیاسیات ہے۔ جس کا موضوع ریاست اور اس کے وظیفے کی ادائیگی کا طرزِ عمل یعنی آئین ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ ریاست کیا ہے؟ کیسے وجود میں آتی

ہے؟ اس کا وظیفہ کیا ہے اور اس کے وظیفے کو ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

فطری علوم میں طبیعات، حیاتیات اور نفسیات شامل ہیں:

ا۔ **طبیعات** کا موضوع مظاہرِ طبیعی (physical phenomena) ہیں۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ مظاہر طبیعی میں حرکت کیسے واقع ہوتی ہے؟

ب۔ **حیاتیات** کا موضوع مظاہرِ حیاتیات (biological phenomena) ہیں۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ عالمِ نامی (organic world) میں تغیرات کیسے رُونما ہوتے ہیں؟

ج۔ **نفسیات** کا موضوع شعور کی کیفیات ہیں۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ مختلف اَعمالِ شعوری (conscious process) کیا ہیں؟ اور کیوں کر وجود میں آتے ہیں؟

فطری علوم اور اُن کی ضروریات

اِن میں سے سب سے پہلے طبیعات وجود میں آئی جو اِبتدا میں فلسفے کا حصہ تھی۔ مگر اس کی نشو و نما کے لیے ضروری تھا کہ وہ فلسفے سے اپنا رشتہ منقطع کر لے۔ اِسی طرح حیاتیات بھی پہلے فلسفے کا جزو تھی۔ جب علومِ فطرت مدوّن ہوگئے تو اِنسان کی توجہ کیفیاتِ شعور کی طرف منعطف ہوئی جس کا مطالعہ نفسیات قرار پایا۔ ان میں سے ہر سائنس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک موضوع (subject matter) ہو، ایک مسئلہ (problem) ہو، منہاج یعنی طریقۂ تحقیق (research methodology) ہو، کچھ مسلمات (postulates) ہوں، ایک وظیفہ (function) ہو اور وظیفہ توجیہ و تعلیل (causal explanation) ہے۔ توجیہ کے لیے ضروری ہے کہ کچھ بنیادی تصورات یا مقولات (categories) ہوں جن کے تحت مشاہدے (observation) سے جمع کیے ہوئے مدلولات (data) کو منظّم کیا جائے اور ایک مفروضہ یعنی (hypothesis) ہو جس کے تحت ان مدلولات کی توجیہ کی جا سکے۔

اِن تمام غیر مذہبی علوم (secular sciences) کی نشو و نما اِقدام و خطا (trial & error method) کے انداز میں ہو رہی ہے۔ اس لیے آج تک ان کی نشوونما کی تکمیل کا رُخ متعین نہیں ہوسکا اور اِقدام و خطا کے انداز میں نشو و نما کا اثر یہ ہے کہ ان علوم کے مقولات اور مفروضات کی صحت کی حدود کو متعین بھی نہیں کیا جا سکا جس کے نتیجے میں طبیعات، حیاتیات اور نفسیات کے درمیان اِلتباس پیدا ہو گیا ہے۔ اِس اِلتباس کو رفع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر سائنس کے اپنے اپنے مقولات اور مفروضات کو اسی مخصوص سائنس کے دائرے میں صحیح سمجھا جائے اور ایک علم کے مقولات (categories) کو دوسرے علم کے مقولات و مفروضات کے طور پر استعمال نہ کیا جائے۔

علمِ طبیعات کے مقولات

علمِ طبیعات کے مقولات یہ ہیں:

۱۔ مادہ بحیثیت جوہر (matter as substance)
۲۔ کمیت (quantity)
۳۔ علت ومعلول (cause & effect)
۴۔ حرکت (movement)
۵۔ مکان، زمان اور قوت (space, time & force)
۶۔ عدد (number)
۷۔ وحدت (unity)

اِسی طرح طبیعات کا مفروضہ جو عالمِ طبیعی میں واقع ہونے والی حرکت کی توجیہ کے لیے اختیار کیا جاسکتا ہے وہ میکانی علت کا مفروضہ ہے۔ اسے hypothesis of mechanical causation کہتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ کسی بے جان وجود میں اُس وقت تک حرکت پیدا نہیں ہوتی جب تک کوئی بیرونی مؤثر اسے ایک نقطہ مکانی سے دوسرے نقطہ مکانی اور ایک لمحہ زمانی سے دوسرے لمحہ زمانی تک منتقل نہ کر دے۔ حالانکہ

عالمِ نامی (organic world) میں جو حرکت واقع ہوتی ہے وہ اَز خود حرکت ہے یعنی وہ spontaneous movement ہے۔ یہ ہرگز کسی بیرونی محرک کا نتیجہ نہیں۔ جو لوگ نامی حرکت کی توجیہ مفروضۂ اِرتقاء (hypothesis of evolution) کی بجائے میکانی علت کے مفروضے سے کرتے ہیں وہ نامی (organic) اور غیر نامی (inorganic) کے درمیان اِلتباس پیدا کر دیتے ہیں۔

اِسی طرح نفسیات میں جو حرکت شعوری طور پر واقع ہوتی ہے، وہ علت غائی (purposive causality) کا نتیجہ ہے۔ اس کی توجیہ میکانی علت یا مفروضۂ اِرتقا سے کرنا شعور اور زندگی کے مظاہر کے درمیان اِلتباس پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ توجیہ میں یہ اِلتباس ڈارون (Darwin) نے اپنی Theory of Evolution میں میکانی علیت کے مفروضے کو اِختیار کر کے غیر نامی سے نامی کی توجیہ کرنے میں پیدا کیا ہے اور نامی اور غیر نامی کے درمیان اِمتیازات ملحوظ نہیں رکھے۔ اس طرح جب ماہرینِ نفسیات نفسیاتی کردار کی توجیہ میکانی علت کے مفروضے سے کرتے ہیں, جیسے واٹسن (Watson) نے behaviourism کے اِستدلال میں شعوری کردار کی توجیہ میکانی علت سے کرنا چاہی تو شعوری اور غیر شعوری حرکت کو انداز نظر انداز کر دیا۔ اِسی طرح مغربی ماہرینِ جرمیات نے جرائم کے اِرتکاب کے اَسباب و محرکات پر بحث کرتے ہوئے جو مختلف مکاتبِ فکر وضع کیے ہیں۔ مثلاً Socialogical School، Positivistic School، Psychological School، Psychiatic School، Ecological School؛ اور یہ سب اپنے اپنے مظاہر کی توجیہ کے لیے غلط مفروضے کے استعمال اور تحقیق میں التباس کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پوری تحقیق نے جرم کی ذمہ داری سے ہر مجرم کو بری ثابت کر دیا ہے اور یہ سوچ بڑے اخلاقی بگاڑ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہے۔

اِنسانی علوم کے اِصلاح طلب پہلو

اگر ہم انسانی علوم (human sciences) کے اِصلاح طلب پہلو کی طرف

توجہ کریں تو واضح ہو گا کہ یہ پہلو فلسفہ اقدام و خطا کے انداز میں نشو و نما پانے کی وجہ سے تضادات میں الجھ گیا ہے۔ اس کی نشو و نما کی تکمیل کا رُخ اس وقت تک متعین نہیں ہو سکتا جب تک علم بِالوحی سے ہدایت حاصل نہ کی جائے۔ مثلاً سب سے پہلے فلسفے کے مسائل کو حل کرنے کے لیے عقلیت (rationalism) کا منہاج اختیار کیا گیا کہ صرف اور صرف عقل ہی ذریعۂ علمِ حقیقت ہے۔ یہ عقل کے ذریعے علمِ حقیقت ہونے کے بارے میں لامحدود یقین کا موقف تھا، جس سے متضاد نتائج برآمد ہوئے اور یہ یقین متزلزل ہو گیا۔ اس کی بجائے حسیت (impericism) کا موقف اختیار کیا گیا تو اس کا اصول یہ تھا کہ حواس ہی ذریعۂ علمِ حقیقت ہیں۔ یہ موقف عقل کے باب میں لامحدود بے یقینی کا موقف تھا، جس نے انجام کار فلاسفہ کو تشکیک میں مبتلا کر دیا۔ چوں کہ ذہنِ انسانی دیر تک تشکیک میں مبتلا نہیں رہ سکتا اس لیے تنقید کا اصول سامنے آیا اور فلسفے میں دورِ تنقید (critical era) کی ابتدا ہوئی اور ذہنِ انسانی اس نتیجہ پر پہنچا کہ علمِ یقینی محسوسات تک محدود ہے اور ماورا محسوسات کا نہ تو انکار جائز ہے اور نہ اس کا علمِ یقینی ممکن ہے۔ اس لیے عملی شعور (practical consciousness) کا تقاضا ابھرا کہ انسان کا نصب العین متعین کیا جائے۔ اس مرحلے پر فلسفے کا مسئلہ یہ ہو گیا کہ انسان اس طرح سوچے کہ میں کیا ہوں؟ اور اس کائنات میں میرا مقام و منصب کیا ہے؟ اور اس کے لحاظ سے میرا نصب العین کیا ہے؟ یعنی فلسفے میں جستجو کا رُخ منظور سے ناظر کی جانب پھر گیا۔ اس میں کانٹ (Kant) اور بعد کے فلسفے میں ہیگل (Hegal) اور مارکس (Marx) شامل ہیں جنھوں نے متضاد نصب العین پیش کیے۔ جن کے نظریات کو مختلف قسم کی اِرادیت (volunteerism) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان سب کی معذوری یہ ہے کہ نصب العین تو بیان کرتے ہیں لیکن اسے حاصل کرنے کا حتمی، قطعی اور یقینی طور پر نتیجہ خیز لائحہ عمل بیان کرنے سے قاصر رہے ہیں اور کسی کی جد و جہد میں کامیابی کی ضمانت میسر نہیں آتی۔ یہ سب کچھ اقدام وخطا (trial & error) کے انداز میں غور کرنے کا نتیجہ ہے ۔ یہاں پہنچ کر انسانیت تضادات میں الجھ گئی ہے اور پورا عالم نظریاتی بحران میں مبتلا ہے۔ ان تضادات نے عالمِ اِنسانیت کو

نہایت مہلک قسم کے تضادات کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔

علوم کی اِصلاح کا رُخ

۱۔ اس صورت حال کی اصلاح علم بِالوحی کی روشنی میں یوں ہو سکتی ہے کہ نصب العین اور اس کے حصول کے لائحہ عمل اور اس لائحہ عمل میں کامیابی سے سازگار تصورِ کائنات کی جستجو کر کے فلسفیانہ فکر کی نشوونما کی تکمیل کا رخ پھر سے متعین کیا جائے اور اس طرح حتماً اور یقیناً کامیاب ہونے کا اعتماد بحال کیا جائے اور قدیم اور جدید فلسفے سے پیدا ہونے والی مایوسی و نا اُمیدی کو اُمید و یقین اور وثوق و اعتماد میں بدل دیا جائے۔

۲۔ مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں ہم اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اِنسانی اِستعداد کی زائیدہ اَخلاقیات (ethics) کی نشو و نما کی تکمیل کا رُخ یوں متعین کیا جائے کہ فضائلِ اَخلاق، اس کے معیار اور ان کی مابعد الطبیعی اَساس کی جستجو سے پہلے اَخلاقیات کا مسئلہ یہ قرار پائے کہ زندگی اَخلاق کے نمونۂ کمال پر کیسے ڈھلے؟ اور جب یہ مسئلہ علم بِالوحی کی روشنی میں حل ہو جائے تو پھر اَخلاقی فضائل کے نمونہ کمال پر ڈھلی ہوئی زندگی کے مشاہدے سے اس کے مضمرات اور معیار کو متعین کیا جائے۔

۳۔ اسی طرح عمرانیات (sociology) کی صحیح نشو ونما کی تکمیل کا رُخ اُس وقت متعین ہوگا جب پہلے علم بِالوحی کی روشنی میں یہ مسئلہ حل کیا جائے کہ نوعِ انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی اَخلاقی جدّ و جہد کرنے اور رُوحانیت پر یقین رکھنے والے اَفراد پر مشتمل ایسا معاشرہ وجود میں کیسے لایا جائے جس میں فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں۔ جب یہ مسئلہ علم بِالوحی کی روشنی میں حل ہوجائے تو پھر یہ جستجو کی جائے کہ مثالی معاشرہ کیا ہوتا ہے؟ کیسے وجود میں آتا ہے؟ اور کس طرح ترقی کرتا ہے؟ کیسے زوال پذیر ہوتا ہے؟ اور پھر اس کے زوال کو عروج میں کیسے بدلا جا سکتا ہے؟

۴۔ اسی طرح معاشیات (economics) سے جو مسئلہ حل نہیں ہوسکتا وہ یہ ہے

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش www.MinhajBooks.com

کہ عادلانہ معیشت کیسے پیدا ہوگی؟ جب علم بِالوحی کی روشنی میں عادلانہ معیشت پیدا کرنے کا طریق دریافت ہو جائے تو پھر یہ مسئلہ بھی حل ہوگا کہ غیر منصفانہ معیشت کا میلان کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس کی اصلاح کیسے ہوسکتی ہے؟ تاکہ علم معاشیات میں اس معاشی عدل کے میسر آنے کی ضمانت مل جائے جو اَفراد کی معاشی تخلیق کی جد و جہد میں تعطّل کو حتمی طور پر رفع کر دے۔

۵۔ اِسی طرح سیاست کا مسئلہ یہ ہے کہ ریاست اور اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور ان کا وظیفہ کیا ہے؟ مگر اب تک جس سیاسی فکر کی نشو و نما ہوئی ہے اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا کہ سیاسی تناقض سے پاک ریاست یعنی ایک فلاحی ریاست کیسے وجود میں آئے جس میں ظلم و اِستبداد راہ نہ پاسکے؟ اور سیاسی کام ذاتی مفادات کے تحفظ کی خاطر نہیں بلکہ دوسروں کی بہتری کے لیے ہو۔ یہ مسئلہ علم بِالوحی کی روشنی میں حل کر کے اس کے بعد ریاست کی ماہیت اور اس کے کردار کو سمجھنے کی صحیح کوشش کی جائے، جس کی شرائط یہ ہوں گی کہ سیاسی زندگی میں پہلے اصلاح طلب پہلو کو متعین کیا جائے، پھر اس نصب العین کو واضح کیا جائے جس کے حوالے سے سیاسی زندگی اصلاح پذیر ہوگی۔ اس کے بعد اس کی عملی اساس مہیا کی جائے۔ پھر نمونہ کمال فراہم کیا جائے۔ پھر اس محرک کی جستجو کی جائے جو استقامت دلا دے اور انحراف نہ کرنے دے۔ اس کے بعد مثالی ریاست کو سمجھنے کی شرائط پیدا ہوں گی کیوں کہ فلاحی ریاست وجود میں آ چکی ہوگی اور اس فلاحی ریاست میں حاکم اور محکوم دونوں میں سے کسی ایک کا بھی محرکِ عمل مطالبہ حقوق (demand of right) نہیں ہوگا بلکہ ان کی تمام تر جد و جہد اِیتائے حقوق یعنی فرائض کی انجام دہی کے لیے ہوگی۔ کیوں کہ مطالبہ حقوق کے طرزِ عمل سے حقوق کا تصادم کبھی ختم نہیں ہوسکتا اور طبقاتی منافرت سے پاک معاشرہ کبھی وجود میں نہیں آ سکتا۔

اس لیے مذہبی علوم کی اصلاح کا امکان بھی صرف اس صورت میں ہے کہ ان کی نشو و نما کا رُخ اقدام و خطا سے متعین ہونے کی بجائے علم بِالوحی سے متعین کیا جائے۔